POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 July 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-07-2026 • Price: 5/- • 15-21 July 2026 • Issue: 27 • Vol:85

۱۵تا۲۱ جولائی ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۲۷ • جلد: ۸۵

اُردو کے قلیل الاستعمال الفاظ و مرکبات (۳)

(اردو لُغت بورڈ کی لُغت کے تناظر میں)

رؤف پاریکھ

اپنی رادھا کو یاد کرو/ کیجیے (کہاوت)

چلتے بنو، ہم سے کچھ مطلب نہیں، اپنا کام کرو، ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔

فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات نے اس کہاوت کا اندراج نہیں کیا۔ البتہ نور اللغات، مہذب اللغات اور لغتِ کبیر میں درج ہے۔ یہ کہاوت مہذب اللغات کے مطابق 'لکھنؤ میں فصحا نہیں بولتے' اور 'عوام بلکہ عورتیں زیادہ بولتی ہیں'۔ مہذب نے ہندو اساطیر سے اس کا پس منظر بھی دیا ہے۔ اردو لغت بورڈ کی لغت نے اس کہاوت کا اندراج کیا ہے اور دو اسناد دی ہیں (جلد اول، ص ۹۸)۔ پہلی سند جان صاحب کی ہے اور مہذب نے بھی جان صاحب کا یہی شعر دیا ہے۔ اردو لغت بورڈ کی لغت نے اس سند کا سال ۱۸۷۹ء لکھا ہے جو غالباً درست نہیں ہے اور اگر درست ہے بھی تو قدیم تر سند موجود ہے جو نواب مرزا شوق لکھنوی (وفات: ۱۸۷۱ء) کی مثنوی فریبِ عشق کی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ فریبِ عشق کا سالِ تالیف ۴۷-۱۸۴۶ء ہو سکتا ہے لیکن رشید حسن خاں نے مثنویاتِ شوق کے مقدمے میں دلائل کے ساتھ لکھا ہے کہ فریبِ عشق کا سالِ تصنیف حتمی طور پر طے نہیں کیا جا سکتا (ص ۳۵-۲۹)۔ بہرحال شوق کی سند قدیم تر خیال کی جائے گی کیوں کہ بورڈ کے اپنے طے کردہ اصولوں کے مطابق اگر کسی سند کا سالِ تصنیف طے نہ ہو سکے تو اس کے مصنف کا سالِ وفات لکھا جائے گا اور نواب مرزا شوق لکھنوی کا انتقال ۱۸۷۱ء میں ہوا تھا۔ اگلے ایڈیشن میں ان کے شعر کو بطور قدیم تر سند شامل کیا جانا چاہیے:

گر مچلکہ نہ اس کا دیجے آپ
اپنی رادھا کو یاد کیجے آپ

(نواب مرزا شوق لکھنوی، مثنویاتِ شوق، ص ۱۸۲)

یاد رہے کہ اس شعر میں یہ الفاظ 'دیجے' (دی ج ے) اور 'کیجے' (ک ی ج ے) ہیں اور ان الفاظ کو یہاں دیجیے (دی ج ی ے) اور کیجیے (ک ی ج ی ے) نہیں لکھا جائے گا۔

اَللہ کا گھر (گھ مفتوح) (مرکبِ اضافی)

۱- خانۂ خدا، خانۂ کعبہ۔
۲- مسجد۔
۳- (مجازاً) دِل۔

آصفیہ، امیر اور نور نے درج کیا ہے۔ مہذب نے 'خانۂ کعبہ' اور 'مسجد' دونوں معنوں میں الگ الگ بنیادی اندراج (headword) کے طور درج کیا ہے، حالاں کہ یہ درست نہیں ہے لغت نویسی کے اصولوں کے مطابق ایسے مواقع پر ایک ہی بنیادی اندراج کی دو شقیں بنائی جاتی ہیں۔ headword کو جدید لغت نویسی کے مباحث میں lemma کہا جاتا ہے)۔ بورڈ نے بھی 'اللہ کا گھر' کی تین شقیں بنائی ہیں (جلد اول، ص ۷۹۵)۔ لیکن پہلے معنی (کعبۂ شریف) کی دو اسناد دی ہیں جن میں سے پہلی ۱۸۶۷ء کی ہے جو رشک لکھنوی (وفات: ۱۸۶۷ء) کے شعر کی صورت میں ہے لیکن راست حوالے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ نور اللغات سے نقل ہے۔ قدیم تر سند استاد ابراہیم ذوق (وفات: ۱۸۵۴ء) کے ہاں موجود ہے:

پِھر آئے اگر جیتے وہ کعبے کے سفر سے
تو جانو پِھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

(ذوق، کلیاتِ ذوق، ص ۲۴۰)

دل چسپ بات یہ ہے کہ بورڈ نے ذوق کی مذکورہ بالا سند تو دی ہے لیکن 'اللہ کا گھر' کے ذیل میں نہیں بلکہ ایک اور بنیادی اندراج کے سلسلے میں اور وہ اندراج ہے 'اللہ کے گھر سے پِھرا' (جلد اول، ص ۷۹۸)۔ اول تو اس کے اندراج میں صیغۂ ماضی کے بجائے مصدر چاہیے۔ یعنی اسے اس طرح ہونا چاہیے تھا: 'اللہ کے گھر سے پِھرنا'، جس کے معنی ہیں: مرتے مرتے بچنا، بیماری میں زندگی کی امید نہ رہنے کے بعد صحت یاب ہو جانا، جیسا کہ مہذب نے بھی لکھا ہے۔ بورڈ نے یہ معنی دیے ہیں لیکن مذکورہ بالا سند کو 'اللہ کا گھر' کے ذیل میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ امیر اللغات نے 'اللہ کے گھر سے پِھرنا' درج کیا ہے اور سند میں ذوق کے منقولہ بالا شعر کے علاوہ بحرؔ (وفات: ۱۸۷۸ء) کا ایک شعر بھی سند میں دیا ہے۔

جو یہ ہے:

گھر سے اللہ کے پِھرتا ہوں جو دل پِھرتا ہے
ایسی ہی ہوتی ہے الفت مجھے جب ہوتی ہے

بورڈ کو چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس سند کو بھی لے لے۔

اللہ کے گھر سے پِھرنا (گھ مفتوح، پھ مکسور) (محاورہ)

مرتے مرتے بچنا، بیماری میں زندگی کی امید منقطع ہونے کے بعد صحت یاب ہو جانا۔

اس کا ذکر اوپر 'اللہ کا گھر' کے اندراج میں آچکا ہے۔

اُنتِیسا (الف مضموم، ن ساکن، ی معروف) (صفت)

یعنی اُنتیس (۲۹) دن کا (مہینا)، (مہینا) جس میں انتیس دن ہوں۔

پلیٹس، آصفیہ، امیر، نور، مہذب اور بورڈ نے انتیسا درج نہیں کیا۔ سند موجود ہے:

☆ کیا ساٹھ سال تک ہر سال محرم تیسا، صفر انتیسا الخ ہوا؟ ... علمِ ہیئت کہتا ہے کہ بعض مسلسل تین مہینے انتیسے ہو سکتے ہیں، مسلسل چار مہینے تیسے ہو سکتے ہیں۔

(محمد حمید اللہ، نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ج ۲، ص ۵۴۳)

لیکن اس کی قدیم تر سند بھی ہوگی جو سرِ دست ہمیں دست یاب نہیں ہو سکی ہے۔

اُولُو الفضل

(الف مضموم، واو غیر ملفوظی، ل مضموم، واو غیر ملفوظی، الف غیر ملفوظی، ل ساکن، ف مفتوح، ض ساکن) (اسمِ فاعل)

آصفیہ، امیر، نور، مہذب اور بورڈ نے درج نہیں کیا۔ معنی ہیں فضل والے لوگ، صاحبانِ فضل۔ مسدسِ حالی میں سند موجود ہے۔ اس شعری سند کو بورڈ نے 'ابوالوقت' کی سند کے طور پر درج کیا ہے اور اس

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

میں 'اولوالفضل' کو 'ابوالفضل' لکھا گیا ہے۔ (یہ تصحیف ہے یعنی حروف یا نقطوں میں تبدیلی سے لفظ کا بدل جانا اور قلمی نسخوں میں اس کی خاصی مثالیں مل جاتی ہیں)۔ ممکن ہے کچھ نسخوں کے متن میں یہی درج ہو۔ لیکن تب بھی بورڈ کو اس سند کی بنیاد پر کم از کم 'ابوالفضل' ہی کا اندراج کرنا چاہیے تھا جو موجود نہیں ہے، یعنی بورڈ نے اس سند کو ایک لفظ کے لیے استعمال کیا اور اس میں دوسرے لفظ کی سند بھی موجود ہے لیکن بورڈ نے نہ ابوالفضل درج کیا ہے نہ اولوالفضل۔ ہر دو صورتوں میں، یعنی خواہ اسے 'ابوالفضل' پڑھا جائے خواہ 'اولوالفضل'، اس سند اور لفظ کا اضافہ بورڈ کو کرنا چاہیے۔:

اولوالفضل یاں اٹھے سرّاج کتنے
ابوالوقت ہو گزرے حلاّج کتنے

(کلیاتِ نظمِ حالی، ج۲،ص۱۵۹)

اَیبک (یائے مجہول نیز یائے لین، ب مفتوح) (اسم، مذکر)

۱- لفظاً: چاند کا سردار؛ (مراداً) سردار، امیر۔
۲- غلام، قاصد، ہرکارہ۔
۳- بت، صنم؛ (مجازاً) معشوق۔
۴- تاجِ خروس نیز ہدہد۔

لغت بورڈ کی لغت میں درج نہیں ہے بلکہ فرہنگِ آصفیہ، نوراللغات، امیراللغات، مہذب اللغات اور جامع اللغات (مرتبہ خواجہ عبدالمجید) میں بھی درج نہیں ہے۔ غالباً اس لیے کہ یہ ایک بادشاہ کا نام ہے اور لغات میں اَعلام صرف اس صورت میں دیے جاتے ہیں کہ ان کو مجازاً یا کنایتہً استعمال کیا جاتا ہو (مثلاً حاتم بمعنی بہت سخی، چنگیز بمعنی ظالم وسفاک، یوسف بمعنی بہت حسین، وغیرہ)، لیکن بعض اوقات عَلَم کا ماخذ کوئی بامعنی لفظ بھی ہوتا ہے اور اس کے لغوی معنی درجِ لغت ہونے چاہییں، جیسا کہ لفظ ایبک کے لفظی معنی ہیں۔ فرہنگِ عامرہ کے مطابق ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے اور عامرہ نے معنی دیے ہیں: غلام، قاصد، معشوق، ہرکارہ، بت، صنم۔ اسٹین گاس نے اس کے دو تلفظ دیے ہیں ایبک (بیائے مجہول) اور اَیبک (بیائے لین) اور معنی لکھے ہیں: بت اور بدخشاں کے ایک گاؤں کا نام۔ بہرحال، لغت میں اس کا اندراج ہونا چاہیے تھا۔ سند بھی موجود ہے جو پیش ہے:

☆ ایبک کی وجہِ تسمیہ... یہ ترکی لفظ ہے۔ اے (یعنی چاند)... بے یا بک کے معنی سردار کے ہیں۔ اس طرح ایبک کے معنی [ہیں] چاند کا سردار۔'

(ابرار حسین فاروقی نقش بندی، کشکول، ص۲۳۔۲۲)

ایک اور سند:

☆ ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے جو قیاساً آی = چاند اور بک = امیر، سردار سے مرکب ہے۔...اس کے معنی تاجِ خروس اور ہدہد لکھے ہیں۔ ہندوستان کے بعض ترک امیروں کے نام کے ساتھ بھی یہ موجود ہے۔

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ج۳،ص۶۱۴)

ایلی (یاے مجہول) (اسم)

اللہ کے مفہوم میں ہے۔

بورڈ نے درج نہیں کیا بلکہ آصفیہ، نور، فیلن، مہذب، فرہنگِ تلفظ، امیر، جامع اور علمی (مرتبہ: وارث سرہندی) میں سے کسی نے درج نہیں کیا۔ پلیٹس نے 'ایلی' درج نہیں کیا لیکن 'ایلی ایلا' درج کیا ہے اور معنی دیے ہیں 'یا علی یا اللہ'۔ پلیٹس نے اس کا اشتقاق 'ہندی' لکھا ہے جو تعجب خیز ہے (لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پلیٹس کے ہاں عربی اور فارسی الفاظ کی اصل کو بھی سنسکرت بتانے کا رجحان ہے، لہٰذا کچھ زیادہ تعجب خیز بھی نہ ہونا چاہیے)۔ کلیاتِ نظمِ حالی کے مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بقول یہ عبرانی لفظ ہے اور 'اللہ' کے معنی میں ہے۔ حالی کی سند پیش ہے:

مظلوم کتنے تیرے سہارے
ایلی ہی ایلی کہتے سدھارے

(کلیاتِ نظمِ حالی، ج۱،ص۴۴۰)

آگے کو کان ہو جانا/ ہونا (محاورہ)

تجربے کے بعد نصیحت ہو جانا، غلطی کے بعد متنبہ ہو جانا، بھول کے بعد آئندہ کے لیے احتیاط کا ارادہ کرنا۔

اس محاورے کا ایک متن 'آگے کو' کے بغیر یعنی صرف 'کان ہو جانا' اور 'کان ہونا' بھی ملتا ہے۔ مہذب اللغات نے 'آگے کو کان ہونا' درج کیا ہے اور معنی دیے ہیں: متنبہ ہونا، آئندہ کے لیے کسی بات سے ہوشیار ہو جانا، لیکن مہذب نے اسے 'غیر فصیح' قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ 'آگے' کی جگہ 'آئندہ' فصیح ہے، لیکن لکھنؤ کی ایک اور لغت نوراللغات نے آگے کو کان ہوئے درج کیا ہے۔ بورڈ نے 'ک' کی تقطیع میں 'کان ہونا' مع اسناد درج بھی کیا ہے (ج ۱۴،ص۵۷۶)۔ لیکن بورڈ نے 'آگے کو کان ہو جانا/ ہونا' کا اندراج نہیں کیا، بلکہ فرہنگِ آصفیہ کا حوالہ دے کر 'آگے کو کان ہوئے' درج کر کے اسے 'فقرہ' قرار دیا ہے جب کہ آصفیہ نے اسے 'محاورہ' لکھا ہے۔ بورڈ نے اس کو 'آگے سے کان پکڑا' سے رجوع کرا دیا ہے۔ وہاں معنی لکھے ہیں 'آئندہ ایسا نہیں کریں گے'۔ حالاں کہ 'آگے کو کان ہونا' بطور محاورہ درج کرنا ضروری تھا۔ اس کے معنی (آئندہ کے لیے احتیاط کرنا وغیرہ) ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ اس کی سند حالی سے پیش ہے:

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

(کلیاتِ نظمِ حالی، ج۱،ص۱۳۹)

آوازہ گری (اسم، مؤنث)

آوازہ کے کئی معنی ہیں، مثلاً اونچی صدا، شور شرابا، چرچا، شہرت، طعنہ، وغیرہ۔

آوازہ کے معنی تو مختلف لغات میں موجود ہیں لیکن 'آوازہ گری' بہت شاذ ہے۔ آصفیہ، امیر، نور، مہذب اور اردو لغت بورڈ کی لغت میں بھی درج نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں: چرچا کرنے یا شہرت دینے کا عمل۔ اسے قاضی عبدالودود نے میر تقی میر کی تصنیف ذکرِ میر کا ذکر کرتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ ذکرِ میر کی تصنیف کے محرکات بتاتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

☆ اپنے بزرگوں کی آوازہ گری، جو دراصل خود اپنی آوازہ گری ہے۔

(عبدالحق بحیثیت محقق، ص۲۱)

بادوباراں (مرکبِ عطفی)

ہوا اور بارش۔ آصفیہ، امیر (جلد سوم) نور، بورڈ نے درج نہیں کیا۔ بادوباراں کے لیے میر کی سند موجود ہے بلکہ شعر بھی خاصا مشہور ہے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں، کم کم بادوباراں ہے

(کلیاتِ میر، ج۳، دیوانِ چہارم، ص۳۷۲)

بعد کے دور میں بھی رائج رہا ہے اور اس کی دوسری سند بھی موجود ہے:

مرے آشیاں کا کیا ہے، مرا آسماں سلامت
ہیں مرے چمن کی رونق، یہی برق و بادوباراں

(شان الحق حقی، حرفِ دل رس، ص۲۱)

پَتُریا (پ مفتوح، ت مضموم نیز ت مفتوح) (اسم، مؤنث)

عورت جو (برا) پیشہ کرتی ہو، طوائف، کسبی، رنڈی۔

پلیٹس کے مطابق اس کا ایک املا 'پَتَریا' (ت مفتوح) بھی ہے اور 'پاتُریا' بھی ہے، نیز اسے 'پاتَریا' بھی لکھا جاتا ہے۔ پلیٹس نے اس کا ایک املا 'پاتُر' اور 'پاتَر' بھی دیا ہے۔ آصفیہ نے درج کیا ہے اور اس کے آگے 'پورب' لکھا ہے۔ پھر اسے پاتر کی تصغیر اور پت (عزت) اتارنے والی لکھا ہے۔ نور نے بھی درج کیا ہے لیکن سند نہ آصفیہ نے دی ہے نہ نور نے۔ مہذب نے اس کا اندراج کیا ہے اور لکھا ہے کہ 'دیہاتیوں' کی زبان ہے لیکن کوئی سند نہیں دی البتہ محلِ استعمال کی وضاحت کے لیے ایک جملہ ہے۔ بورڈ نے 'پتریا' درج کیا ہے اور اسناد بھی دی ہیں لیکن آخری سند ۱۹۴۱ء کی دی ہے۔ بعد کے دور میں بھی رائج رہا ہے۔ پتریا کی ایک سند بعد کے دور سے حاضر ہے:

☆ وہ پتریا نہیں ہے، چچی جان۔ برے ماحول میں رہ کر بھی اتنی پاک باز عورت ہے۔

(سعیدہ بانو احمد، ڈگر سے ہٹ کر، ص۱۰۳)

مآخذ:

۱- احمد، سعیدہ بانو، ڈگر سے ہٹ کر، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۶ء۔
۲- حالی، الطاف حسین، کلیاتِ نظمِ حالی، جلد۱ (مرتبہ افتخار احمد صدیقی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۸ء۔
۳- حالی، الطاف حسین، کلیاتِ نظمِ حالی، جلد۲ (مرتبہ افتخار احمد صدیقی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۸ء۔
۴- حقی، شان الحق، حرفِ دل رس، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۱ء۔
۵- حمید اللہ، محمد، نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، جلد۲ (مرتبہ محمد عالم مختارِ حق)، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۶ء۔
۶- خاں، رشید حسن (مقدمہ)، مثنویاتِ شوق، کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء۔
۷- ذوق، ابراہیم، کلیاتِ ذوق (مرتبہ تنویر احمد علوی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۹ء (طباعتِ دوم)۔
۸- شوق لکھنوی، نواب مرزا، مثنویاتِ شوق (مرتبہ رشید حسن خاں)، کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۹۹ء۔
۹- صدیقی، افتخار حسین (مرتب)، کلیاتِ نظمِ حالی، جلد۲ (مرتبہ افتخار احمد صدیقی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۸ء۔
۱۰- عبدالودود، قاضی، عبدالحق بحیثیت محقق، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء۔
۱۱- فاروقی نقش بندی، ابرار حسین، کشکول، علی گڑھ: فرینڈز بکس ہاؤس، ۱۹۸۰ء۔
۱۲- میر، میر تقی، کلیاتِ میر، جلد۳، دیوانِ چہارم (مرتبہ کلب علی خاں فائق)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۲ء (طبعِ دوم)۔
۱۳- اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد۳، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء (بارِ دوم)۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)

E-mail: drraufparekh@yahoo.com

اُردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر

رؤف پاریکھ

قیمت: 300 روپے

سرسیّد کے تاریخی کارنامے

ڈاکٹر مرضیہ عارف

محسنِ قوم سرسیّد علیہ الرحمہ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں، وہ ہندستانی مسلمانوں کی بدحالی اور سماجی و تعلیمی پس ماندگی کا زمانہ تھا۔ مسلم قوم کو اِس زوال کی گہرائی سے نکالنے کے لیے سرسیّد اور اُن کے رفقا نے جو تحریک شروع کی اُس کا مقصد مسلمانانِ ہند کو سیاست سے دور رکھ کر تعلیمی اور سماجی لحاظ سے اُونچا اُٹھانا تھا، اِس تحریک کو 'علی گڑھ تحریک' کا نام دیا گیا۔ اِسے موثر بنانے کے لیے سرسیّد نے تین طریقے اپنائے۔

پہلا طریقہ ملک کے اتحاد اور قومی یک جہتی کو ہر قیمت پر پیشِ نظر رکھنا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ سرسیّد نے مدرستہ العلوم علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے ضرور قائم کیا لیکن اِس کے وجود میں آنے سے آج تک اِس درس گاہ کے دروازے کسی غیر مسلم کے لیے بند نہیں کیے گئے، اِس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سب سے پہلے گریجویٹ ہندستان کے مشہور مورخ ایشوریہ پرساد تھے۔ سرسیّد نے علی گڑھ کالج میں دوسرے مضامین کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا اور ایک قابل پنڈت کیدار ناتھ کو اس کے لیے مقرر کیا۔ سرسیّد کی اِسی رواداری کا نتیجہ تھا کہ کالج کے لیے چندہ دینے والوں میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی بھی تھی۔، کالج کے 50 کمروں میں سے تقریباً 9 کمرے اہلِ ہنود کے چندے سے تعمیر ہوئے، سرسیّد کسی قیمت پر اِس کے لیے تیار نہیں تھے کہ کالج کے ہندو طلبہ میں کسی طرح کا احساسِ کمتری پیدا ہو یا اُنھیں مذہبی بنیاد پر امتیاز کا سامنا کرنا پڑے۔ 1882 میں جب بعض مسلمانوں نے بی اے میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے مسلم طلبہ کے لیے گولڈ میڈل کا انتظام کیا تو سرسیّد نے کالج کے پرنسپل کو لکھا کہ وہ اُن ہندو طلبہ کو جو بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کریں گے اپنی طرف سے گولڈ میڈل دیں گے۔ سرسیّد کا 1898 میں جب انتقال ہوا اُس وقت کالج میں 285 مسلمان اور 64 ہندو زیرِ تعلیم تھے اور سات اساتذہ میں دو ہندو اُستاد تھے۔

سرسیّد کی دل سوزی اور فکر کا نتیجہ ہے کہ 1947 کے پُر آشوب زمانے میں علی گڑھ اتحاد و اتفاق کا گہوارہ بنا رہا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندو اور مسلمانوں میں کسی طرح کی تفریق نظر نہیں آئی۔ علی گڑھ سے دور رہنے والے کچھ بھی الزام لگائیں لیکن کوئی بھی انصاف پسند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قومی یک جہتی کے خلاف کسی قول و فعل کی شہادت نہیں دے سکتا۔

علی گڑھ کا ماحول ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی مثال بنا رہا اور یہ سب سرسیّد کی یک جہتی کے لیے تلقین اور اتحاد و اتفاق کے درس کا نتیجہ تھا۔ سرسیّد پر دو قومی نظریے کی حمایت کا جو الزام لگاتے ہیں وہ ایک بھی مثال ایسی پیش نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اپنی تقریر یا تحریر میں کسی موقع پر دو قومی نظریے کی تبلیغ کی ہو یا کسی فرقے کی برائی زبان پر لائی ہو۔ 'پائنیر' کے ایڈیٹر کے الفاظ میں: 'وہ نباضِ قوم تھے اور اُن کا ہر فیصلہ سیاسی نقطۂ نظر سے لیکن قومی مفاد میں ہوا کرتا تھا'۔

یہی وجہ ہے کہ سرسیّد کو سب نے سراہا اور نباضِ قوم کی حیثیت سے سب نے اُنھیں تسلیم کیا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اُنھیں قوم پرست اور قومی یک جہتی کا داعی و مبلغ قرار دیا جو ہر قیمت پر اتحاد و اتفاق چاہتے تھے اور یہی اُن کی زندگی کا مشن تھا۔ ایک موقعے پر یک جہتی کے بارے میں وہ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: 'اِس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ مسلمان، مسلمان نہ رہیں اور ہندو ہندو نہ رہیں یا اپنا اپنا طریقِ کار چھوڑ دیں بلکہ یک جہتی سے میری مراد یہ ہے کہ لوگ دنیوی معاملات میں اپنے مذہب کی بُنیاد پر کسی تعصب و تنگ نظری کا شکار نہ ہوں بلکہ مذاہب کے اختلاف کے باوجود سب ہندستانی ایک دوسرے کی بھلائی کے لیے عمل کریں۔ آج تقریباً سوا ڈیڑھ صدی کا عرصہ ہو رہا ہے، سرسیّد کا یہ پیغام زندۂ جاوید ہے اور اِس پر عمل پیرا ہونے کی پہلے سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے، بد قسمتی سے لوگ اُن کے مقصدِ حیات کو سمجھنے میں ناکام رہے، بیشتر نے یہ سمجھا کہ وہ صرف ایک مسلم کالج کے بانی تھے۔ حالاں کہ سرسیّد زندگی بھر ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کرتے رہے، اُن کی تحریک سے قومی یک جہتی کو کبھی نقصان نہیں پہنچا، اِسی لیے گاندھی جی کی اُن کے بارے میں رائے تھی کہ اُن سے زیادہ بے تعصب اور قومی اتحاد کا علمبردار اِس وقت کوئی نہیں ہے۔

سرسیّد نے اپنی تحریک کو زُود اثر بنانے کے لیے دوسرے طریقے کے طور پر 'تہذیب الاخلاق' اور 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' (انگریزی میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ') جیسے اصلاحی اخبارات جاری کیے اور 'سائنٹفک سوسائٹی' کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور متمول طبقے کو اپنی اصلاحی تحریک کی طرف راغب کیا اور اِس کے لیے اُردو نثر کا نہایت سادہ اور سلیس اسلوب اپنایا اور زبان کو مبالغہ آرائی سے پاک رکھا۔ معیاری انگریزی مضامین کو اُردو قالب میں ڈھالا اور اِس طرح چھوٹے چھوٹے مضامین میں علم و حکمت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور زندگی کے اصول و آداب پر قلم اُٹھا کر پڑھنے والوں کے ذہنوں کو مانجھنے کا کام کیا۔ کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو، اِن مضامین میں اِس خوبی سے بیان ہوتا کہ قاری کے دل میں اُتر کر ذہن کو روشن کر دیتا۔ غرضیکہ سرسیّد کے اخبارات بالخصوص 'تہذیب الاخلاق' نے آل احمد سرور کے الفاظ میں: 'نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا۔ بلکہ سوچنا اور محسوس کرنا بھی سکھایا، اُس نے نہ صرف زندہ رہنے کا گُر بتایا بلکہ تہذیب و شائستگی سے زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا اور نہ صرف دنیاداری پیدا کی بلکہ قابلِ فہم دینداری جو سمجھ میں آ سکے اور سمجھائی جا سکے۔' بحیثیت مجموعی سرسیّد نے اپنی صحافت کے وسیلے سے جہاں جدید نثر کو فروغ دیا وہیں علی گڑھ تحریک کو مقبول بنانے میں بھی اِس سے کام لیا۔

سرسیّد نے اپنی تحریک کو زُود اثر بنانے کے لیے دوسرے طریقے کے طور پر 'تہذیب الاخلاق' اور 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' (انگریزی میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ') جیسے اصلاحی اخبارات جاری کیے اور 'سائنٹفک سوسائٹی' کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور متمول طبقے کو اپنی اصلاحی تحریک کی طرف راغب کیا اور اِس کے لیے اُردو نثر کا نہایت سادہ اور سلیس اسلوب اپنایا اور زبان کو مبالغہ آرائی سے پاک رکھا۔ معیاری انگریزی مضامین کو اُردو قالب میں ڈھالا اور اِس طرح چھوٹے چھوٹے مضامین میں علم و حکمت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور زندگی کے اصول و آداب پر قلم اُٹھا کر پڑھنے والوں کے ذہنوں کو مانجھنے کا کام کیا۔ کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو، اِن مضامین میں اِس خوبی سے بیان ہوتا کہ قاری کے دل میں اُتر کر ذہن کو روشن کر دیتا۔

سرسیّد کا تیسرا اور سب سے مہتم بالشان کارنامہ مسلمانوں کو زوال و ادبار سے نکال کر مغربی علوم اور عصری فنون سے آشنا کرنا تھا، اِس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے تعلیمی درس گاہیں قائم کیں۔ غازی پور اور مراد آباد کے بعد علی گڑھ کو عصری تعلیم کا مرکز بنایا، یہاں جو مدرستہ العلوم (24 مئی 1875) انھوں نے قائم کیا وہ چند سال کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (8 جنوری 1877) بن گیا۔ سرسیّد انگلینڈ سے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کر کے آئے تھے اور علی گڑھ کے کالج میں اُسی طرح سائنس کی تعلیم دینا چاہتے تھے کیوں کہ اِس کے بغیر اُنھیں ترقی کی دوڑ میں مسلمانوں کے پچھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کالج کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لیے کھلے رہیں، اُن کا یقین تھا کہ اگر دونوں یعنی ہندو مسلمان ایک ہی بینچ پر بیٹھ کر ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کریں گے تو دونوں میں اخوت، ہمدردی اور محبت کے جذبات پروان چڑھیں گے، وہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے کو ترقی دینا چاہتے تھے جو دنیا کا اعلا ترین ادارہ ہو، جہاں تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی بہترین تربیت بھی ہو۔

شدید مخالفت کے باوجود یہ کالج قائم ہو گیا اور اِس کے لیے سرسیّد نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ یکم ستمبر 1920 میں آغا خان کی موثر نمائندگی سے کالج کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا اور ایک خواب جو پودے کی شکل میں نمودار ہوا تھا، تناور درخت بن گیا، اِس یونیورسٹی سے طلبہ قابل ترین فرزند بن کر نکلے جو بعد میں ادیب، شاعر، ڈراما نویس، سائنس داں، مُصور، کھیل کے میدانوں سے نام پیدا کرنے والے اور اُردو انگریزی کے شعلہ بیان مقرر بنے غرضیکہ ہر میدان میں قابل و ماہر انسان تسلیم کیے گئے، لیکن 1947 کے تقسیم ملک کے المیے نے یہ ستم ڈھایا کہ پڑھے لکھے اور باصلاحیت مسلمانوں کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ اِس جانکسل صورتِ حال میں ڈاکٹر ذاکر حسین اِس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے اور اُنھوں نے مختلف شعبوں کے ماہرین کا یونیورسٹی میں تقرر کیا، ہوشیار اساتذہ کو دوسرے ممالک بھیج کر تربیت دلوائی اس طرح یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار واپس آیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نہ صرف ملک کی ممتاز یونیورسٹی ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کا وقار قائم ہے اور اس کے بہترین نظامِ تعلیم نے اپنی ساکھ برقرار رکھی ہے۔

مکان نمبر 4، اسٹریٹ نمبر 1، ریت گھاٹ روڈ، بھوپال-462001
Mob. 6267843376

اردو دُنیا

صحافت کے ساتھ اردو زبان کے تحفظ میں
'انقلاب' کا بنیادی کردار

سہارنپور (21 جون)۔ ملک کے ممتاز اور کثیر الاشاعت اردو روزنامہ 'انقلاب' کے دہلی ایڈیشن کی پندرہویں سالگرہ کے موقعے پر قومی اتحاد کمیٹی سہارنپور کے زیرِ اہتمام ایک تہنیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر روزنامہ 'انقلاب' کے مدیران، صحافیوں اور تمام کارکنان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے عوام سے اخبار کو پڑھنے اور اردو کے فروغ کی اپیل کی گئی۔ عیدگاہ روڈ پر واقع قومی اتحاد کمیٹی کے دفتر میں منعقدہ اس تقریب میں روزنامہ 'انقلاب' کے خصوصی سالگرہ نمبر کا اجرا بھی عمل میں آیا، بعدازاں قومی اتحاد کمیٹی کے صدر حاجی ایم شاہد زبیری نے عیدگاہ روڈ، منڈی سمیتی روڈ، ندیم کالونی اور اطراف کے علاقوں میں سالگرہ نمبر اور اخبار کی کاپیاں تقسیم کیں۔ اس موقعے پر حاجی ایم شاہد زبیری نے اردو زبان کی اہمیت، اس کے فروغ اور اردو اخبارات کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ 'انقلاب' نے نہ صرف صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں بلکہ اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور نئی نسل کو اردو سے جوڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ شمالی ہند میں اردو صحافت کے اعتبار سے روزنامہ 'انقلاب' ایک معتبر اور باوقار شناخت رکھتا ہے، اس لیے ہم سب کی ذمے داری ہے کہ ہم اردو اخبارات کو خرید کر پڑھیں، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں اور نئی نسل کو اردو زبان و ادب سے جوڑنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان اور صحافت کے فروغ کے لیے کام کرنے والے افراد، اداروں اور اخبارات کی حوصلہ افزائی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس موقعے پر کامران زبیری، محمد عارف سمیت مقامی افراد اور قومی اتحاد کمیٹی کے عہدیداران اور کارکنان موجود تھے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو زبان وتہذیب کے فروغ کے لیے
نئی نسل کو جوڑنا ضروری: لیکھ راج

نئی دہلی (24 جون)۔ اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ سمر کیمپ اور اردو تھیٹر ورکشاپ کے تربیت یافتہ بچوں نے سری رام سنٹر، منڈی ہاؤس میں شاندار ثقافتی پروگرام پیش کرکے حاضرین سے بھرپور داد وصول کی۔ تقریب میں داستان گوئی، غزل گائیکی اور بچوں کے ڈرامے 'چیونٹی، چیونٹے اور چینی' نے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ پروگرام کے آغاز میں اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری لیکھ راج نے تمام فنکاروں کو پودا پیش کرکے استقبال کیا، جب کہ نظامت اطہر سعید نے کی۔ اپنے خطاب میں لیکھ راج نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی گذشتہ تین دہائیوں سے تھیٹر ورکشاپ کے ذریعے بچوں میں فن، ادب اور تہذیب کو فروغ دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی مثال ہے اور ہمیں نئی نسل کو اس زبان سے جوڑنے کی مسلسل کوشش کرنی چاہیے۔ تقریب میں ساحل آغا اور اسما رحمان کی نگرانی میں بچوں نے مختلف دلچسپ داستانیں پیش کیں، جب کہ علویہ اور فوزیہ نے بالترتیب قتیل شفائی اور تسلیم فاضلی کی غزلیں پیش کرکے حاضرین کو خوب متاثر کیا، ڈاکٹر ذیشان ضمیر نے ہارمونیم پر ان کا ساتھ دیا۔ بعد ازاں فہد خاں کی ہدایت کاری میں بچوں نے تقریباً نصف گھنٹے پر مشتمل ڈراما 'چیونٹی، چیونٹے اور چینی' پیش کیا۔ دلچسپ کہانی، جاندار اداکاری، برجستہ مکالموں اور خوب صورت موسیقی سے مزین اس ڈرامے میں تحفظِ ماحولیات کا موثر پیغام بھی دیا گیا جسے ناظرین نے بے حد سراہا۔ تقریب کے اختتام پر لیکھ راج نے تمام شرکا میں اسناد تقسیم کیں۔ اس موقعے پر اساتذہ، والدین، سرپرستوں اور ادب وثقافت سے وابستہ افراد کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (انقلاب۔ دہلی)

'جدید الٰہیات اور سائنس' کے درمیان
اجتہادی مکالمے کی ضرورت

نئی دہلی (23 جون)۔ معروف اسلامی مفکر، معاصر مسلم افکار و نظریات کے ماہر اور یونی ورسٹی آف نوٹر ڈیم (امریکہ) کے پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) میں 'جدید الٰہیات اور سائنس' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ اس پروگرام میں اساتذہ، محققین، طلبہ اور مختلف علمی وفکری حلقوں سے وابستہ افراد کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اپنے خطبے میں پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں مسلم الٰہیات کو درپیش چیلنجز اور مواقع پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم علما اور دانشوروں کو جدید سائنسی علوم کے ساتھ مثبت اور تعمیری انداز میں مکالمہ قائم کرنا چاہیے، جب کہ اسلامی روایت کی اخلاقی اور روحانی بنیادوں سے مضبوط وابستگی بھی برقرار رکھنی چاہیے۔ ان کے مطابق مسلم الٰہیات کو صرف کلاسکی مباحث تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے سائنس، ٹیکنالوجی اور انسانی علم میں ہونے والی نئی پیش رفت سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینے کے قابل ہونا چاہیے۔ پروفیسر موسیٰ نے یہ بھی واضح کیا کہ جدید سائنس اور مغربی جدیدیت کے دباؤ کا جواب تمام مسلم علما نے یکساں انداز میں نہیں دیا۔ انھوں نے اسلامی تہذیب کی علمی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں مسلم علما نے وحی اور عقل کے درمیان ایک متوازن اور فعال تعلق قائم کیا تھا، جس کے نتیجے میں علم وتحقیق کے مختلف میدانوں میں نمایاں ترقی ہوئی۔ پروفیسر موسیٰ نے اس روایت کی تجدید کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تنقیدی فکر، علمی کشادگی اور بین العلومی مکالمہ عصرِ حاضر میں مسلم فکری احیا کے لیے ناگزیر ہیں۔ پروگرام کا آغاز نسیم احسن نے آیاتِ قرآنی کی تلاوت وترجمے سے کیا۔ اجلاس کی صدارت انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین پروفیسر افضل وانی نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے پروفیسر ابراہیم موسیٰ کے خطاب کو نہایت بصیرت افروز اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا۔ اس سے قبل سوال و جواب کا معلوماتی سیشن منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر ناز خیر، محمد علی، ڈاکٹر تالیف حیدر وغیرہ کے سوالات کے جوابات خطیب نے دیے جب کہ خطیب موصوف کا تعارف ڈاکٹر جاوید اختر اور خطبے پر تبصرہ پروفیسر محمد اسحاق نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت شیخ محمد نظام الدین نے کی۔ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر حسینہ حاشیہ نے شکریے کی تجویز پیش کی۔

(انقلاب۔ دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعزیتی نشستیں

نئی دہلی (19 جون)۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے سابق استاد، ماہرِ ابلاغیات اور تھیٹر کے ممتاز محقق اور ناقد پروفیسر محمد شاہد حسین کے سانحۂ ارتحال پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صدر شعبۂ اُردو پروفیسر کوثر مظہری نے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر محمد شاہد حسین اپنے طلبہ کے لیے نہایت مشفق و مہربان تھے۔ انھوں نے بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی خدمات انجام دیں۔ وہ نہایت خوش خلق اور منکسرالمزاج تھے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ وہ ایک شریف النفس اور دیانت دار معلّم تھے اور اپنے میدان میں خاصی گرفت رکھتے تھے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ میں نے بحیثیت طالبِ علم جے این یو میں انھیں برسوں تک دیکھا، سنا اور ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ سادگی تھی۔ وہ نرم خو تھے اور میں نے انھیں کبھی بھی غیظ وغضب میں نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ وہ میرے پی ایچ. ڈی کے ممتحن تھے۔ ان کی طبیعت میں خاکساری تھی۔ وہ کوئی بھی کام رواروی میں نہیں کرتے تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر شاہنواز فیاض اور ڈاکٹر نوشاد منظر نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

دوسری طرف عہدِ حاضر میں ادبِ اطفال کی ممتاز شخصیت اور بچوں کے معروف ماہنامہ 'گل بوٹے' کے بانی و مدیر فاروق سیّد کے سانحۂ ارتحال پر بھی شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست میں شعبے کے اساتذہ نے مرحوم کی ادبی خدمات، بالخصوص ادبِ اطفال کے فروغ میں ان کے گراں قدر کردار کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر کوثر مظہری نے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فاروق سیّد نے ادبِ اطفال کو ایک تحریک کی شکل دی۔ ان کا ماہنامہ 'گل بوٹے' کئی دہائیوں سے بچوں کو صحت منداور معیاری ادب فراہم کرتا رہا ہے۔ ان کی رحلت سے ادبش اطفال کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے مرحوم کی صحافتی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ خاموشی اور دل سوزی کے ساتھ بچوں کے ادب کی اشاعت وترویج میں مصروف رہے۔ آج کے دور میں جب بچوں کا ادب کمرشیل ازم کا شکار ہوتا جارہا ہے، فاروق سیّد جیسے افراد ایک مثال اور عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ فاروق سیّد نے ادبِ اطفال کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ تعلیم وتربیت کا ایک موثر وسیلہ بنایا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ ادبِ اطفال کی نشرواشاعت ان کے لیے صرف پیسہ نہیں بلکہ ایک جنون تھی۔ 'گل بوٹے' جیسے منصوبوں کو آگے بڑھانا ہی ان کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر شاہنواز فیاض اور ڈاکٹر نوشاد منظر نے بھی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے اہلِ خانہ سے تعزیت کا اظہار کیا۔ اجلاس کا اختتام مرحوم کے لیے مغفرت اور بلندیِ درجات کی دعا پر ہوا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو قلم کاروں کی ڈائرکٹری (جلد دوم) کی تاریخ میں توسیع

بنگلور۔ ریاست کرناٹک کے ادبا، شعرا اور صحافیوں کی کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور کے زیرِ اہتمام بہ عنوان 'کرناٹک کے اردو قلم کاروں کی ڈائرکٹری (جلد دوم)' زیرِ ترتیب ہے۔ ریاست کے تمام قلم کاروں کے لیے یہ خبر خوش آئند ہے کہ وہ اکیڈمی کی ویب سائٹ thhp://urduacademy.karnataka.gov.in پر دستیاب سوالنامہ برائے ڈائرکٹری حاصل کریں اور پُر شدہ سوالنامہ مع تصویر اور ضروری دستاویزات مثلاً تعلیمی لیاقت کی اسناد، مطبوعہ تخلیقات کے نمونے وغیرہ کے ساتھ دفتر اکیڈمی کے پتے پر ارسال کریں۔ اب اس کی تیاری کے لیے تمام قلم کار 5 اگست 2026 تک سوالنامہ اکیڈمی دفتر کو بھیج جاسکتے ہیں۔ (روزنامہ جنوبی سہارا۔ بنگلور)

ہر محبِّ اُردو اپنے حصّے کی شمع روشن کرے

انگریزی اور تلگو میں بھی مہارت ضروری

حیدرآباد (14 جون)۔ پروفیسر مہ جبین اختر (رٹائرڈ عثمانیہ یونیورسٹی) نے نئے تعلیمی سال 2026-27 کی آمد کا خیرمقدم کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں کہا کہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اردو زبان ہندستانی زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے، اس کا اندازِ بیان میٹھا ہے اور اس کے دلکش اسلوب کو ساری کائنات میں پسند کیا جاتا ہے چاہے وہ فلمی گانے ہوں یا ڈائیلاگ کی شکل میں ہوں۔ ڈراما، ناول، رسالوں، مشاعروں، تعلیمی نصاب یا ادبی محفل اور انجمنیں، غرض یہ کہ ہر جگہ اردو کے استعمال کے بغیر نامکمل سی لگتی ہے۔ پروفیسر مہ جبین اختر نے کہا کہ حکومتِ تلنگانہ نے اردو کو دوسری سرکاری کا درجہ دیا ہے، یہ لائقِ ستائش اقدام ہے۔ انھوں نے والدین سے اپنے بچوں کو اردو میڈیم مدارس اور کالجوں میں داخلہ دلوانے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور عربی ایک عالمی زبان ہے، ان دونوں زبانوں کا سیکھنا، سمجھنا، پڑھنا اور لکھنا ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے اردو میڈیم مدارس اور کالجوں میں حکومت کی جانب سے دی جانے والی سہولتوں کا ذکر اور خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو چاہنے والے ہر فرد کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اردو کی بقا و تحفظ کے لیے اپنے اپنے حصے کی شمع ضرور روشن کرے۔ انھوں نے کہا کہ والدین سرکاری اردو میڈیم کے مدارس و کالجوں میں بچوں کو پڑھائیں اور ان کی تعلیمی صورتِ حال پر مسلسل نظر رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر انگریزی میڈیم گورنمنٹ یا پرائیویٹ اسکول کالج وغیرہ میں بچے پڑھ رہے ہیں تو لازمی طور پر انھیں اردو بطور زبانِ دوم ضرور پڑھائیں، علاوہ اس کے اردو اخبارات، رسالے وغیرہ خرید کر پڑھیں۔ اس ڈیجیٹل دور میں بھی مطالعہ نہ صرف معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ ذہنی سکون بھی عطا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی میں مہارت اور تلگو زبان سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے، ہم اردو میڈیم میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور تلگو زبان کو مطلق نظرانداز نہیں کرسکتے۔ مہاراشٹر کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں کے اضلاع کے اردو میڈیم سے پڑھے بچے قومی اہلیتی امتحانات اور مسابقتی امتحانات میں اول درجے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ SIR میں بھی اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے درج کروائیں اور ہوسکے تو سرکاری اردو میڈیم اسکولوں کی بقا اور ترقی کے لیے وہاں کے غریب طلبہ کی مالی مدد بھی کی جائے، کسی بچے کی کفالت (اسپانسر) کی جائے۔ یقین جانیے کہ یہ بھی کارِ ثواب میں شمار کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ دیں۔ اردو اور اردو اساتذہ صرف اپنی نوکری پر ہی نظر نہ رکھیں بلکہ ان پر دوہری ذمے داری عائد ہوتی ہے، جس زبان کی روٹی کھائی جارہی ہے اس کے لیے مضبوط بنیاد چھوڑ جائیں۔ اردو ایسی زبان ہے کہ اس نے ہندستان کی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیا ہے، یہ زبان نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ یاد رکھیں اردو زبان صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ یہ ہماری تاریخ ہے، شناخت ہے، تہذیب و تمدن اور ثقافت ہے، اس کی حفاظت کی ذمے داری ہماری ہے ورنہ آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

غالب اکیڈمی میں نثری نشست

’جہانِ غالب‘ کے نئے شمارے کی رونمائی

نئی دہلی (29 جون)۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں منعقدہ ماہانہ نثری نشست میں اردو کے معروف افسانہ نگار خورشید حیات نے کہا کہ آج کی اردو اور ہندی کہانیاں اپنے عہد کے سچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس نشست میں اردو اور ہندی کے ادیبوں نے اپنی کہانیاں اور مضامین پیش کیے۔ بیشتر تخلیقات میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا، بعض کہانیاں روایتی انداز کی تھیں جب کہ کئی تخلیقات معاشرتی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے مطابق تمام کہانیوں میں اپنے عہد کی حقیقت نمایاں تھی۔ نشست میں چشمہ فاروقی نے ’جدید رہائش گاہ‘ کے عنوان سے اپنا افسانہ پیش کیا جس میں لکھنؤ کی تہذیب اور مشرقی اقدار کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کی دردناک تصویر پیش کی گئی۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے پروفیسر خلیل احمد بیگ کی کتاب ’مبادیاتِ لسانیات‘ پر تفصیلی تنقیدی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کے ذریعے مصنف نے اردو میں جدید لسانیات کی تدریس کو آسان بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس موقعے پر شارق اعجاز عباسی نے اپنا پُرتاثیر افسانچہ ’دیدہ ور‘ پیش کیا۔ سیما کوشک نے ’پیار، پریوار اور سماج‘، احترام صدیقی نے ’چھوٹی سی بات‘، معروف کہانی کار، مکالمہ نگار اور شاعر کوی کویشور نے ’وہ ٹکٹ‘، راجندر یادو نے ’دادی ماں‘، راج ویر سنگھ نے ’سپنے بھی سوکھ گئے‘، یوگیندر سنگھ نے ’انوکھی خوشی‘ اور پروین ویاس نے ’سنتن کو کہاں سیکری سو کام‘ کے عنوان سے اپنی کہانیاں سنائیں جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ نشست کے اختتام پر ادبی رسالہ ’جہانِ غالب‘ کے شمارہ نمبر 42 کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر کی عمارت میں

فی الحال کلاسز جاری رکھنے پر اتفاق

لکھنؤ (29 جون)۔ اترپردیش میں اردو آئی اے ایس/ پی سی ایس اسٹڈی سنٹر کی عمارت کو واپس لیے جانے کے معاملے پر منعقدہ اہم میٹنگ میں فی الحال اسٹڈی سنٹر کی کلاسز بدستور جاری رکھنے پر اتفاقِ رائے قائم ہوا تاکہ زیرِ تعلیم طلبہ کی پڑھائی متاثر نہ ہو۔ میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ اس معاملے کا حتمی فیصلہ اترپردیش حکومت بالخصوص محکمۂ اقلیتی بہبود اور محکمۂ لسانیات کی اعلاسطحی میٹنگ میں کیا جائے گا۔ ذرائع کے مطابق میٹنگ میں محکمۂ لسانیات کے انڈر سکریٹری شریک نہیں ہوئے جب کہ اترپردیش اردو اکیڈمی کے سکریٹری شوکت علی نے میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے اردو آئی اے ایس/ پی سی ایس اسٹڈی سنٹر کی عمارت خالی کرانے کی صورت میں پیدا ہونے والی تعلیمی اور انتظامی دشواریوں سے متعلق حکام کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ میٹنگ میں محکمۂ اقلیتی بہبود کے ڈائرکٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر بھی موجود تھے۔ یاد رہے کہ محکمۂ اقلیتی بہبود کے ڈائرکٹر کی جانب سے جاری مکتوب کے مطابق اس میٹنگ میں اسٹڈی سنٹر کی عمارت کو محکمۂ اقلیتی بہبود کے استعمال میں واپس لینے کی تجویز پر غور کیا جانا تھا۔ میٹنگ کے لیے محکمۂ اقلیتی بہبود، محکمۂ لسانیات اور اترپردیش اردو اکیڈمی کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ذرائع کے مطابق میٹنگ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اس وقت تقریباً 70 طلبہ اسٹڈی سنٹر میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، جب کہ نئے تعلیمی سیشن کے لیے داخلے کا عمل بھی جاری ہے۔

واضح رہے کہ اردو آئی اے ایس/ پی سی ایس کوچنگ سنٹر کی عمارت محکمۂ اقلیتی بہبود کی ملکیت ہے، جسے 10 سال کے لیے اترپردیش اردو اکیڈمی کے سپرد کیا گیا تھا اور معاہدے کی مدت مکمل ہونے کے بعد عمارت واپس لینے کی کارروائی شروع کی گئی ہے۔ تاہم حکومتی ذرائع کا کہنا ہے کہ چوں کہ یہ اسکیم کابینہ کی منظوری سے شروع ہوئی تھی اور محکمۂ لسانیات کو اس کے لیے سالانہ بجٹ بھی فراہم کیا جاتا ہے، اس لیے کسی بھی تبدیلی سے قبل حکومت کی اعلاسطحی میٹنگ میں فیصلہ ضروری ہوگا۔ فی الحال میٹنگ میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا سیّد سلمان حسینی ندوی

لکھنؤ۔ ہندستان و عالمِ اسلام کے ممتاز عالمِ دین، دارالعلوم ندوۃ العلما کے سابق استاذِ حدیث، جامعہ سیّد احمد شہید کٹولی ملیح آباد کے ناظم مولانا سلمان حسینی ندوی 29 جون 2026 کو فجر کی نماز سے قبل تقریباً تین بجے اپنی رہائش گاہ پر مالکِ حقیقی سے جاملے۔ وہ صبح تہجد کے لیے اٹھے تھے، نوافل سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ انھیں ہارٹ اٹیک آیا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے اور داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا کی عمر تقریباً 72 برس تھی۔ آٹھ ماہ قبل عارضۂ قلب کے سبب انھیں پیس میکر لگایا گیا تھا۔ مولانا کے انتقال سے نہ صرف ہندستان بلکہ عالمِ اسلام میں بھی غم کی لہر دوڑ گئی۔ دنیا بھر کی اہم شخصیات نے اہلِ خانہ سے تعزیت پیش کی ہے۔ مولانا کی نمازِ جنازہ ان کے بیٹے مولانا یوسف حسینی ندوی نے ادا کرائی اور کٹولی، ملیح آباد میں واقع جامعہ سیّد احمد شہید کے احاطے میں جمِ غفیر کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

مولانا سیّد سلمان حسینی ندوی نے معروف دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں نصف صدی تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔ وہ عالمی اتحاد برائے علماے اہلِ اسلام کی مجلسِ امناء کے رکن رہے۔ انھوں نے پوری زندگی حدیثِ نبوی کی خدمت، تعلیمی و دعوتی کام میں صرف کردی۔ مولانا سیّد سلمان حسینی ندوی کے انتقال پر عالمِ اسلام کی اہم شخصیات نے تعزیت پیش کی ہے۔ ان میں اتحاد علما کے صدر علی محسن القرضافی داغی، سلطنتِ عمان کے مفتی شیخ احمد بن حمد الخلیلی، مفتی محمد الحسن ولد ادوو، ڈاکٹر علی السلاوی جنرل سکریٹری اتحاد علماء المسلمین سمیت درجنوں شخصیات شامل ہیں۔ ہندستان کے بزرگ عالم مولانا سجاد نعمانی، تبلیغی جماعت کے ذمے دار مولانا سعد کاندھلوی کے علاوہ شہر لکھنؤ کے علما اور دیگر اہم شخصیات نے بھی تعزیت پیش کی ہے۔

مولانا سلمان حسینی ندوی کی پیدائش 1954 میں لکھنؤ کے ایک علمی خاندان میں ہوئی۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ریاض (سعودی عرب) میں واقع امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی کے کلیۂ اصول الدین کے شعبۂ حدیث میں داخلہ لیا اور وہاں سے 1980 میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اپنی علمی خدمات کے لیے معروف ہیں۔

محفوظ رحمانی

سیتاپور۔ اردو ادب کی بزمِ مزاح اور شعری دنیا کے ایک درخشندہ ستارے، ممتاز و معروف ہزل گو شاعر محفوظ الرحمٰن محفوظ رحمانی کا 81 برس کی عمر میں 23 جون 2026 کو انتقال ہوگیا۔ وہ صدر جمعیۃ علماے سیتاپور کے مشہور و معروف شاعر و صحافی مست حفیظ رحمانی کے سب سے چھوٹے بھائی اور نوجوان صحافی و سماجی کارکن خوشتر رحمانی کے حقیقی چچا تھے۔ ان کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی علمی، ادبی اور عوامی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی اور بڑی تعداد میں محبین اور معززینِ شہر نے ان کی رہائش گاہ پر پہنچ کر تعزیت کا اظہار کیا۔ ان کے شعری مجموعے ’کوہ قطعات‘ کی رسمِ اجرا ابھی حال ہی میں گذشتہ 31 مئی 2026 کو انتہائی تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی تھی، جہاں اہلِ علم نے ان کی ادبی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

ادارہ ’ہماری زبان‘ مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **تفہیم و تعبیر** (ادبی، تنقیدی و تحقیقی مضامین)
مصنفہ : ڈاکٹر ثمر جہاں
اشاعت : 2025
ضخامت : 169 صفحات
قیمت : 250روپے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، A-170 گراؤنڈ فلور-3، سوریہ اپارٹمنٹ دلشاد کالونی، دہلی-110095
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

ڈاکٹر ثمر جہاں کا شمار ایک ذہین اور تازہ دم اسکالروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے نسائی تنقید پر خاطر خواہ کام کیا ہے جس کی پذیرائی ادبی حلقوں میں خوب سے خوب تر ہوئی ہے۔ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔دہلی حکومت میں درس و تدریس سے وابستہ ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنا ادبی سفر جاری و ساری رکھا ہے۔دہلی یونی ورسٹی سے انھوں نے ’اُردو افسانے میں عورت کا تصور‘ (2014) کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔اسی یونی ورسٹی سے 2008 میں موصوفہ ’جوگندر پال کی افسانہ نگاری‘ کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ تحریر کر چکی ہیں۔تاریخ اور ادب ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ڈاکٹر ثمر جہاں کا پہلا مضمون ’ماہ نامہ عصمت تحریک نسواں کا علم بردار‘ رسالہ آجکل، دہلی میں فروری 2014 میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر ثمر جہاں نے اپنی محنتِ شاقہ سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے تحقیقی و تدوینی کارناموں کو جس تواتر کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا وہ لائق تحسین ہے۔موصوفہ کی اب تک نصف درجن سے زائد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں تنویر احمد علوی کا جہانِ معنی (دو جلد، 2017)، نشاناتِ نور (2022)، شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسائی گیتوں کی روایت (2024)، تنویر احمد علوی (مونوگراف 2025)، اُردو افسانے میں عورت کا تصور (2025) کے علاوہ شیخ یحیٰ منیری کے مکتوبات کا معاشرتی و تہذیبی مطالعہ اور تنویر احمد علوی کی ادبی شخصیت و تحقیقی خدمات اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر ثمر جہاں کی ایک اہم کتاب ہے جسے انھوں نے دو حصوں ’ادبی و تنقیدی مضامین‘ اور ’تحقیقی مضامین‘ میں تقسیم کیا ہے۔’ادبی مضامین‘ میں 14 مضامین بالترتیب ماہ نامہ عصمت تحریکِ نسواں کا علم بردار، خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں انسان دوستی کا تصور، کرشن چندر: جمالیاتی حس کا کنہیا، منٹو کے کرداروں میں انسانی اقدار کے روشن پہلو، ابرار نعمی کی شاعری میں قوس قزح کے رنگ، اُداس نسلیں: ایک تجزیاتی مطالعہ، آزادیِ نسواں کے حامی مرزا عظیم بیگ چغتائی، برج بانو کا عاشق کنہیا لال کپور، شاہد احمد دہلوی اور رسالہ ساقی، جوگندر پال سے ایک انٹرویو، ممتاز شیریں کا تنقیدی شعور، راجہ گدھ کی معنوی جہتیں، ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ اور غالب کا ہے اندازِ بیان اور شامل ہیں۔ دوسرے حصے ’تحقیقی مضامین‘ میں تنویر احمد علوی اور اصولِ تحقیق و ترتیب و متن، علم و ادب کا ستون: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، بحر العلوم ڈپٹی نذیر احمد: حیات و ادبی خدمات، ابوالکلام آزاد اور تحریکِ آزادی، بے لوث محقق: تنویر احمد علوی، تنویر احمد علوی کی غالب شناسی، بارہ ماسہ کی مشترک ادبی روایت اور ہندستانی عورت، منٹو کے خوابوں کی تعبیر: شمس الحق عثانی جیسے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر ثمر جہاں نے اپنے مضمون ’ماہ نامہ عصمت: تحریکِ نسواں کا علم بردار‘ میں رسالہ عصمت کی ادبی و علمی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس رسالے نے ہندوستانی مسلم سماج میں خواتین کی ایک بڑی تعداد کو خواندگی کے ساتھ ساتھ نسائی تہذیب و ثقافت سے بہرہ ور کیا۔اس رسالے کے مدیر راشد الخیری خود خواتین کی تعلیم کے لیے ہمیشہ فکر مند رہے۔انھوں نے اپنے رسالے میں احکام شریعت کی روشنی میں مسلم معاشرے کی حالتِ زار پر تبادلۂ خیال کیا۔

مضمون ’منٹو کے کرداروں میں انسانی اقدار کے روشن پہلو‘ میں ڈاکٹر ثمر جہاں نے منٹو کے اُن افسانوں کا تجزیہ کیا جن میں خواتین کرداروں کو مرکزیت حاصل ہے۔ان افسانوں میں افسانہ ’موذیل‘ کا کردار ترلوچن، ’گوپی ناتھ‘ کا کردار گوپی ناتھ، ’ممی‘ کا کردار ممی، ’کالی شلوار‘ کا کردار سلطانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ڈاکٹر ثمر جہاں نے مختصراً مذکورہ بالا کرداروں کی کمیوں اور خامیوں کے ساتھ ان کی اچھائیوں اور برائیوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔مضمون کے اختتام پر موصوفہ رقم طراز ہیں کہ منٹو غالباً پہلا افسانہ نگار ہے جس نے سماج کے سب سے نچلے طبقے کے مسائل کو اتنے قریب سے دیکھا اور سمجھا۔اس نے معاشرے کی سچی تصویر پیش کی ہے جہاں اُردو کا قاری منٹو کی ذہانت و انسان دوستی کا قائل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ثمر جہاں نے کنہیا لال کپور کی شخصیت اور ان کی ادبی فتوحات کو مضمون ’برج بانو کا عاشق: کنہیا لال کپور‘ میں بیان کیا ہے۔تقسیمِ ہند کے المیے کو کنہیا لال کپور نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا بلکہ تقسیم کے درد کو از خود برداشت کیا۔انھوں نے لاہور سے موگا (پنجاب، ہندستان) ہجرت کی جہاں انھوں نے اُردو ادب کی تاعمر خدمت کی۔انھوں نے اُردو اور ہندی کے رشتوں کو اپنے مضامین میں سلیقے کے ساتھ پیش کیا۔’برج بانو کنہیا لال کپور کا وہ شاہکار مضمون ہے جس میں انھوں نے مزاحیہ اسلوب کا سہارا لے کر اُن لوگوں پر طنز کیا جو اُردو اور ہندی کے رشتوں میں درار پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔

’شاہد احمد دہلوی اور رسالہ ساقی‘ مضمون میں ڈاکٹر ثمر جہاں نے ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کے ادبی مرتبے کا تعین کیا ہے۔شاہد احمد دہلوی خالص دہلی والے تھے۔1947 سے پہلے اِن دہلی والوں پر ان کے مضامین ’اُجڑے دیار‘ عنوان سے شائع ہوئے۔تقسیمِ ہند کے المیے کے بعد ان کے مضامین ’دہلی کی بپتا‘ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ 1952 میں ’دلّی کی چند ادبی شخصیتیں‘ عنوان سے خاکوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے غیر مطبوعہ خاکوں کو ’بزم خوش نفساں‘ نام سے 1964 میں شائع کیا۔شاہد احمد دہلوی کی زبان محاوراتی و ٹکسالی زبان تھی۔موسیقی سے انھیں خاص شغف تھا۔شاہد احمد دہلوی نے دہلی سے رسالہ ساقی 1930 میں جاری کیا۔اس کا پہلا شمارہ ’دلّی نمبر‘ تھا۔تقسیم ہند کے بعد شاہد احمد دہلوی پاکستان ہجرت کر گئے لیکن رسالہ ساقی کراچی سے جاری و ساری رہا۔انھوں نے اُردو ادیبوں و شاعروں کے مسودوں کو ساقی بک ڈپو سے شائع کیا۔کرشن چندر کا مشہور ناول ’شکست‘ بھی ایک ہزار کے معاوضے کے بعد شاہد احمد دہلوی نے شائع کیا۔

ڈاکٹر ثمر جہاں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں سے خاصی متاثر ہیں۔انھوں نے اس کا ذکر اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے متعلق پانچ مضامین شامل ہیں۔ان پانچوں مضامین میں علوی صاحب کے علمی و ادبی کارناموں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔’علم و ادب کا ستون‘ مضمون میں موصوفہ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتابوں ’لمحوں کی خوشبو، کلیاتِ ذوق، اصول تحقیق ترتیب و متن، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تحقیق، اُردو میں بارہ ماسہ کی روایت: مطالعہ و متن، اوراقِ معنی، غالب کی فارسی شاعری تعارف و تنقید، کلاسکی اُردو شاعری کے روایتی ادارے کردار اور علامتیں، سفرناموں میں دلی، کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔

’ممتاز شیری کا تنقیدی شعور‘ میں داکٹر ثمر جہاں نے ممتاز شیری کی تنقید پر صحت منداور مثبت انداز میں گفتگو کی ہے۔ممتاز شیری کا شمار اُردو کی اُن خواتین تنقید نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے منٹو پر قلم اٹھا کر ’منٹو نہ نوری ناری‘ کتاب تخلیق کی۔اس کتاب میں ممتاز شیریں نے منٹو کی افسانہ نگاری اور جنسیات پر اچھوتے موضوعات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ممتاز شیریں پیدا تو ہندستان میں ہوئیں لیکن انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔اُردو ادب میں ان کی تنقید کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ممتاز شیریں نے مغربی ادب کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کی تحریروں میں تقابلی انداز بہ درجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر ثمر جہاں نے ’ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ‘ میں اس تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تنقیدی بحث کی ہے۔انگارے کے افسانہ نگاروں کی ذہنی سطح اور ان کے ادبی وقار و معیار کے بارے میں موصوفہ لکھتی ہیں کہ یہ قلم کار ادیب، شاعر اور نقاد بھی تھے، جو سرمایہ دار نظام کے خلاف مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے ساتھ انسان دوستی، محبت و اخوت کا رشتہ رکھتے تھے۔ڈاکٹر ثمر جہاں نے ترقی پسند تحریک کے افکار و نظریات کو اُردو افسانوں کے لیے مفید و کار آمد قرار دیا۔انھوں نے یہ بھی لکھا کہ یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے عوام کے مسائل کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

بہرنوع! ڈاکٹر ثمر جہاں نے اپنی پہلی ادبی کاوش میں اپنا مطمح نظر صاف و دوٹوک رکھا ہے۔نہ کسی کی بے جا تعریف کی ہے نہ بے جا تنقید۔ان کے تنقیدی نظریات پر کسی تحریک و رجحان کے اثرات نہیں ہیں البتہ وہ نسائی تنقید پر گہری نظر رکھتی ہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی تحقیق و تنقید میں عورت کے مسائل و ذاتی کرب کو مرکزیت حاصل ہے۔انھوں نے اپنے پیش لفظ میں اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ وہ اُردو سے پہلے تاریخ کی طالبہ تھیں۔اس لیے ان کی تنقیدی تحریروں میں تحقیق و تاریخ کے دیدار جا بجا ہوتے ہیں۔راقم موصوفہ کو ان کی پہلی کتاب منصۂ شہود پر لانے کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہے۔

◆◆◆

اردو ہندی ڈکشنری

انجمن ترقی اردو (ہند)

قیمت: 300روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری

مولوی عبدالحق

قیمت: 500روپے

علامہ شبلی کی شخصیت: ’کاروانِ حیات‘ کی روشنی میں

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں‘‘

(ایضاً،ص:92)

مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت اور خاص طور سے ان کی سحر خیزی کا ذکر درجِ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

’’فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ وکمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتا سر مغز بے پوست تھی، بہ مشکل کوئی مہینا ایسا گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی ہو، وہ کیا گئے علم وفن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہوگیا۔

مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے، والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنادیا ہے۔ اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتہ انس پیدا کردیا تھا، جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف وکیفیت کا وقت ہوتا، چائے کا دور چلتا اور علم وفن اور شعر وادب کے چرچے رہتے، ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملّایانہ طلبِ علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی، خشکیِ طبع جو اس راہ کے مہالک وآفات میں سے ہے، انہیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔‘‘

(کاروان خیال،ص:93)

علامہ شبلی کی فارسی شاعری سے مولانا ابوالکلام آزاد بے حد متاثر تھے اور ان کی شاعری کو بے نظیر قرار دیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’شاعری کے ذوق وفہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصے میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے، ہندوستان میں فارسی شاعری غالبؔ پر نہیں ان پر ختم ہوئی، کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالبؔ جو کچھ ہے تغزل ومدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوق اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر وتخئیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں، خصوصاً حیدرآباد والی نظم، اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا، اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے، جب ایران کے نئے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں، جن کی ترتیب واشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں، آج کل ایران کے ملک الشعرا بہارؔ ہیں، خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا (شبلی) کے یہاں غالبؔ سے کہیں زیادہ سرجوشی وکیفیت ہے اور حقائق وواردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سیکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے ابھر آتا ہے:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے، کیوں کہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے، جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی، خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔

افسوس اب وہ وقت آگیا کہ ان تذکروں کے لیے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا، کہاں جایئے اور کس سے باتیں کیجیے، جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہوگئے، ہاں الحمدللہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے، لیکن یکجائی میسر نہیں۔

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می ماند‘‘

(کاروان خیال،ص:94 تا 96)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس خط کے جواب میں حبیب شبلی نے پھر علامہ شبلی نعمانی کو یاد کیا اور ’شعرالعجم‘ کے حوالے سے لکھا:

’’شعرالعجم میں علامہ مرحوم نے شیخ (حزیں) کو نہیں مانا، میں نے ٹوکا، ایک بار سے زیادہ، بنارس میں مزار شیخ دیکھا ہے اور اس کو غزل فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے، تیسری یاد علامہ شبلی مرحوم کی آپ کے پرشوق الفاظ نے آتشِ شوق تیز کردی، اسی زمانے میں ایک طرفہ اتفاق پیش آیا، مدتِ دراز کے بعد رباعیاتِ سحابی نجفی کا ایک عمدہ نسخہ ہاتھ آگیا، رباعیات کی تلاش شروع ہوئی کس قدر ہیں، کہاں کہاں ہیں، میں نے یاد دلایا کہ ستمبر 1907 میں ’الندوہ‘ میں مولانا نے ایک مضمون سحابی پر شائع کیا تھا، ’الندوہ‘ دیکھا، اسی ضمن میں ایک دوسرے مضمون میں ایک دوآتشہ جام نگاہِ شوق میں چھلک گیا، مآثر رحیمی کے طبع ہونے کا شوق ظاہر فرمایا گیا ہے، اس ضمن میں چار نام زبانِ قلم پر آئے ہیں، چوتھا نام میرا تھا، اس عنوان سے ’حبیب صادق‘ جوشِ کیف میں جھوم گیا، حضرت میر درد کا شعر یاد آیا، کیف دوبالا ہوگیا:

دونوں جہاں کی نہ رہی پھر خبر اسے
دو پیالے جس کو آنکھوں نے تیری پلا دیے

مولانا کے دونوں دو پیالے تھے بلکہ دو خم نہیں دو میخانے۔

آج تک جب یاد آتے ہیں سرشار نیاز کردیتے ہیں:

من شیشہ بدل دارم پیمانہ بدل دارم
قربان نگاہ تو میخانہ بدل دارم

شبلی کی نگاہ! دل مست ذوق کیوں کر نہ ہو، رحمت الٰہی بروے۔‘‘ (ایضاً،ص ۹۷ تا ۹۹)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی کی سوانح عمری ’حیاتِ شبلی‘ کی تصحیح حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک خط کا جواب لکھا تو والہانہ ذکر شبلی کے ساتھ اس تصحیح کا بھی ذکر کیا اور لکھا:

’’اعظم گڑھ سے مسودہ حیاتِ شبلی کے اجزا آتے رہے، پڑھتا رہا، بھیجتا رہا بے مبالغہ بیک وقت بیسیوں صفحے پڑھے، جب رکھے حسرت رہی کہ اور پڑھے ہوتے، سرگذشت کا لطف حکایت نے دیا:

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی حکایتیں بنیں گی

دل محسوس کرتا تھا کہ علامہ کی صحبت میں حاضر ہوں، لطفِ صحبت سے مستفید، فیض یاب ہوں، آہ کیا صحبت تھی، کیا فیض تھا، فخر اس میں تھا کہ ہر موقعے پر ایک نیازمند حاضرِ خدمت آتا تھا، شبلی وشروانی کی زندگی کچھ اس طرح منور رہی کہ جہاں علامہ کا فضل نورافشاں وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ بیز ہے۔‘‘ (کاروان خیال،ص:106 تا107)

’کاروانِ خیال‘ کے یہ چند اقتباسات سچ تو یہ ہے کہ بڑے بڑے مقالات پر بھاری ہیں اور علامہ شبلی کی بلند پایہ شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

641. Shaista Manzil, Pura Gulami,
Behind Awas Vikas
Azamgarh-276001(UP)
+919838573645
Email: azmi408@gmail.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میرؔ کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-

علامہ شبلی کی شخصیت

’کاروانِ حیات‘ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علاّمہ شبلی نعمانی (1857-1914) اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (1864-1950) کا عہد تقریباً ایک ہی ہے، البتہ مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) کا میدانِ عمل پون صدی سے زیادہ عرصے بعد کا ہے، لیکن ان کے علمی وادبی، تعلیمی اور سیاسی نظریات ایک ہی تھے۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے اہلِ قلم آزاد اور شروانی کو علامہ شبلی کے نقطۂ نظر کا حامی اور ہم نوا قرار دیتے ہیں۔ شبلی و شروانی میں 1887 میں تعلقات قائم ہوئے، جب کہ شبلی و آزاد میں 1899 میں رشتۂ انس و محبت قائم ہوا۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر 12 سال تھی۔ دونوں کے تعلق کا آغاز علم وادب کی بدولت ہوا۔ اگر ان دونوں بزرگوں کے ربط و ضبط پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے درمیان خالص علمی ربط و تعلق رہا۔ آزاد کے نظریۂ شعر وادب کی طرح ان کا سیاسی نقطۂ نظر بھی شبلی کے افکار وخیالات سے متاثر معلوم ہوتا ہے، گو بعض اہلِ علم اس سے اختلاف کریں مگر اب کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ دونوں کے ذہنی اشتراک و اختلاف ہر مسئلے میں صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں شبلی آزاد کے ذہن و دماغ کو عجائبِ روزگار میں شمار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمھیں تو کسی علمی نمائش میں بطور ایک اعجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔ (آزاد کی کہانی، ص: 13-312)

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کا جہاں ذکر کرتے ہیں ایک بڑے بزرگ کے مرتبہ اور نہایت احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ علامہ شبلی نے تقریباً تمام مواقع پر ان کا علمی تعاون کیا۔ دوسرے ’لسان الصدق‘ سے ’الہلال‘ تک انھوں نے علمی رہنمائی اور مدد کی۔ غالباً اسی متنوع اور گوناگوں تعلقات کا نتیجہ ہے کہ بعض اور تصانیفِ آزاد میں علامہ مرحوم کا ذکر خیر ملتا ہے۔ ’کاروانِ خیال‘ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا علامہ شبلی کے حوالے سے اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا۔

’کاروانِ خیال‘ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے چند مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ اس کا دورانیہ 4 ستمبر 1940 سے 12 نومبر 1946 تک ہے۔

مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور کاروان خیال کے طابع و ناشر ہیں، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس کا طویل مقدمہ جو 57 صفحات پر مشتمل ہے، محمد عبدالشاہد خاں شروانی کے قلم سے ہے۔ اس میں شامل مکتوبات میں علامہ شبلی کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ افادیت کے پیشِ نظر ان مباحث کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

’کاروانِ خیال‘ کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد کے خط سے ہوا ہے جو 4 ستمبر 1940 کا مکتوبہ ہے۔ مولانا آزاد مولانا شروانی کے نام لکھتے ہیں:

> ”آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی، جب الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا، 1905 کی بات ہے، پورے پینتیس برس ہوگئے، اس وقت یاد آرہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے، اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی، دہلی کا جلسہ ندوہ آپ کو یاد ہے، غالباً 1909 یا 1910 کی بات ہوگی، مرحوم مولانا شبلی آپ اور میں مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں، امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسے کے موقعے پر وہاں قیام، یہ غالباً 1912 کی بات ہے، اٹھائیس برس ہوگئے، اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کل کی بات ہو۔“ (کاروان خیال، ص:60)

مولانا ابوالکلام آزاد کے مذکورہ بالا خط کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے جو خط لکھا ہے، اس میں بھی غالباً جواباً علامہ شبلی کا ذکرِ خیر آیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

> مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک ان کی یاد جان آفریں ہے۔ دارالمصنّفین میں تو گویا تجدید بیعت ہوجاتی ہے:
>
> دماغ دل دریں جا گاہ گاہے چاق می گردد
> خدا آباد تر سازد وخرابات محبت را“

(کاروان خیال، ص: 65)

اب کے علامہ شبلی کا ذکر حبیب شبلی نے چھیڑا ہے، بات شعر وادب کی تھی اور ان کو بے ساختہ علامہ شبلی یاد آ گئے۔ مولانا شروانی مولانا آزاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ”دیکھیے اس ہفتے میں مولانا [شبلی] کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی، آپ کے الطاف نامے سے، مولوی سیّد سلیمان کے خط سے، ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی ایک نادر نسخہ رباعیات سحابی نجفی کا ہاتھ آیا، مولانا کا نسخہ یاد آیا، ندوہ سے اس بابت خط و کتابت کی۔“ (ایضاً، ص:66)

مولانا ابوالکلام آزاد کے دوسرے خط کے جواب میں مولانا شروانی لکھتے ہیں:

> ”آپ کو دجلہ کی مواجی اور شب ماہ کی تابش یاد آئی، مجھ کو خود اپنی طبیعت کی مواجی اور تلاطم نے بے تاب کردیا، کیا کہوں کیا عالم تھا اور کس کے اثر سے تھا، اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے، جو اسی کیف میں موزوں ہوئی تھی:
>
> زجام لعل تو مستم شراب را چہ کنم
> خوشم بسوز دل خود کباب را چہ کنم
>
> یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے۔ اسی طرح پر میں نے غزل عرض کی تھی:
>
> زچشم مست تو ہستم شراب راچہ کنم
> زتاب حسن تو سوزم کباب راچہ کنم
> حدیث دوست بگوشم رسد زپردہ دل
> حکایت نئے وصوت رباب راچہ کنم
> نہ کردہ جلوۂ بت شوخ و باختم دل ودیں
> اگر بر افگند ازرخ نقاب راچہ کنم
>
> حسبِ عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظہ میں پیش کی گئی، حیدرآباد سے 19 دسمبر 1901 کو تحریر فرمایا: خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے ’اگر برافگند ازرخ...‘۔
>
> دیکھیے 32 اور چالیس برس کے گزرے ہوئے دو واقعے کس طرح متصادف ہوگئے، یہ خلوص ذوق کا کرشمہ ہے کہ آپ کو بہت سے اہلِ کمال یاد آئے تھے، مجھ کو ایک علامہ کی یاد نے محو ذوق بنادیا:
>
> ولیس للہ بمستنکر
> ان یجمع العالم فی واحد
>
> رحمت باد بر شبلی۔ نعمت بر آزاد
>
> حدیث تازہ گویم“

(ایضاً، ص: 84)

اس کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ”آپ کی غزل پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے، جو اس عہد میں مل سکتی تھی، یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے:
>
> حدیث دوست بگوشم رسد زپردۂ دل
> حکایت نئے وصوت رباب راچہ کنم
>
> اور نقاب کے قافیے میں تو واقعی ردیف چیخ اٹھی ہے:
>
> اگر برافگند ازرخ نقاب راچہ کنم
>
> علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا:
>
> ولیس للہ بمستنکر
> ان یجمع العالم فی واحد
>
> خواجہ حالؔی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***